اردو شاعری اور اشتراکیت

ڈاکٹر محمد ذاکر

تلخیص: اشتراکیت ایک ایسا نظریہ زندگی ہے جس کے تحت سماج میں مساویانہ اصولوں کے تحت ہر فیصلہ کی تائید کی گئی ہے۔ سماج میں ہر ایک کے حقوق کی پاسداری کی جانی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ میں برابری کا نظام قائم ہونا چاہیے تاکہ کوئی شخص بھی اپنے بنیادی حقوق سے محروم نہ رہ سکے۔ یہ فلسفہ زندگی اس پرانے نظام کے خلاف احتجاج کی صورت میں منظر عام پر آیا جس نے سماج میں اقتصادی، معاشی اور معاشرتی نابرابری کا استحصالی نظام قائم کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد دنیا نے تبدیلی کی ایک نئی صورت دیکھی جو سماج میں بسنے والے ہر فرد کے لیے مفید و معاون ثابت ہوئی۔ اس کے پھیلاؤ میں تمام زبانوں کے ادیبوں اور شعراء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جہاں تک اردو زبان کے شعراء و ادباء کا تعلق ہے تو اس کی تائید میں باقاعدہ اردو زبان میں ایک تحریک ترقی پسند تحریک کے عنوان سے بھی چلائی گئی جس کی بنیاد ہی اشتراکی فلسفہ پر تھی۔ پھر اس کے بعد یہ سلسلہ تھما نہیں آج بھی ہمارے ادباء و شعراء اس آواز کو اپنے کلام کے ذریعے اٹھا رہے ہیں۔ زیر بحث مضمون میں اس حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی جو باذوق قارئین کی کی تشفی کا سبب بنے گی۔

کلیدی الفاظ: قوت ادراک، استدلال و استنباط، لفظی پیکر، آتش سیال، اشتراکیت

انسان مختلف اعضاء اور متنوع قوتوں کا مجموعہ ہے۔ ان متنوع قوتوں میں دو قوتیں ایسی ہیں جو انسان کے تمام افعال اور ارادت کا سرچشمہ ہیں یعنی قوت ادراک

اورقوت احساس۔قوت ادراک کا کام اشیاء کا معلوم کرنا اور استدلال واستنباط سے کام لینا ہے۔تمام ایجادات، تحقیقات، انکشافات اور علوم وفنون اسی قوت کے عمل کا نتیجہ ہیں۔اور جہاں تک قوت کا تعلق ہے تو یہ قوت تب پیدا ہوتی ہے جب کوئی مؤثر واقعہ ذہن ودل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ان دونوں اعضاء کو متاثر کرتا ہے۔جیسے غم کی حالت صدمہ میں مبتلا کر دیتی ہے،خوشی کی وجہ سے مسرت حاصل ہوتی ہے،حیرت انگیز بات پہ متعجب ہونا وغیرہ۔احساس وجذبے کی ان تمام کیفیات کو احساس انفعال بھی کہتے ہیں یا پھر انگریزی زبان میں فیلنگس (Feelings) کہہ لیجئے۔ادراک واحساس کی ان قوتوں سے وجدان اور ذوق کی راہیں ہموار ہوتی ہیں جو انسان کی اعلیٰ صفات کے اظہار کا سبب بنتی ہیں۔اظہار کی تمام صفات جو اپنا بھرپور مظاہرہ کر چکی ہیں ان میں ایک نتیجہ خیز صفت ادب و فن کی ہے جس کے نمونے کئی صورتوں میں واضح ہو چکے ہیں۔کہیں تحریری اور کہیں تعمیری صورت میں۔جہاں تک تحریری صورت کا تعلق ہے تو اس میں ادب،شاعری،فلسفہ اور دیگر علوم وغیرہ شامل ہیں اور تعمیری صورت میں فن معماری کے اعلیٰ نمونے جو ہمارے ماضی کا بیش قیمتی سرمایہ اور ہماری تہذیب وثقافت کی مجموعی ترقی کے ضامن ٹھہرے۔ان تمام صورتوں میں ایک صورت ایسی بھی ہے جو برائے راست ذوقی اور وجدانی عمل کے نتیجہ ہیں میں تیار ہوتی ہے اور جس کی کوئی جامع اور مانع تعریف ممکن نہیں وہ شاعری ہے۔شاعری ذوق انسانی،احساس قلبی اور اضداد کیفیات جذبات کی مجموعی اور تاثراتی صورت کا نام ہے جو لفظی پیکر میں ڈھل کر وجود پاتی ہے۔جذبہ کی محسوس کیفیت جب احساسات سے ہو کر تجربہ کی صورت اختیار کر لے تو وہ شاعری بن جاتی ہے۔مثال کے طور پر جب حیوانات پر کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ اس کا اظہار مختلف قسم کی آوازوں یا حرکات سے کرتے ہیں جیسے شیر چنگھاڑتا ہے،طاؤس ناچتا ہے،اسی طرح باقی حیوانات بھی جذبات کا اظہار مختلف انداز میں کرتے ہیں۔یہی معاملہ انسان کا بھی ہے لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات کے مقابل کئی ایسی خوبیوں سے نوازا ہے جو اسے اشرف المخلوقات ہونے کے درجے پر فائز کرتی ہیں۔ان میں دو نہایت ہی اعلیٰ اور صفاتی قوتیں ایسی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔وہ نطق اور گویائی کی قوتیں ہیں۔اور انہی دونوں قوتوں کے سہارے انسانی

احساسات وجذبات اظہار پاتے ہیں۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب انسان پر کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو اس کی زبان سے بے ساختہ چند کلمات یا پھر موزوں الفاظ نکلتے ہیں جنہیں ہم شعر کہتے ہیں۔ بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب جذبات الفاظ کے پیکر میں ڈھل جائیں اور سننے والے پر وہی اثر کریں جو صاحب جذبہ کے دل پر تو وہ شعر کہلاتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات کو برانگیختہ بھی کرے اور ان کو تحریک میں بھی لائے۔شعر کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا برائے راست تعلق مختلف انسانی جذبات و کیفیات سے ہے جیسے استعجاب یا حیرت،خوشی یا مسرت،غم و یاس واضطراب وغیرہ۔ان سب کے علاوہ بھی کچھ فطرت کے مظاہر ہیں جنہیں احساسات وجذبات کی زبان جب عطا ہوتی ہے تو بھی شاعری بن جاتے ہیں جیسے نیلگوں فلک،نجم درخشاں،نسیم سحر،تبسم گل،خرام صبا، نالۂ بلبل،ویرانی دشت،شادابی چمن وغیرہ۔اسی طرح موسیقی،مصوری،صنعت گری بھی انسانی جذبات واحساسات کے اظہار کی موثر ترین صورتیں ہیں لیکن ان کی اہمیت اور تعلق چند مخصوص حواس سے ہے۔جیسے موسیقی صرف قوت سامعہ کی وجہ سے دل و ذہن کو محظوظ کر سکتی ہے۔سامعہ نہ ہو تو یہ کسی کام کی نہیں۔یہی معاملہ مصوری کا ہے بینائی نہ ہو تو تصویر متاثر نہیں کر سکتی۔لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے خواہ وہ سامعہ ہو، باصرہ ہو،ذائقہ ہو،شامہ یا پھر لامسہ ہو۔اس بات کو ہم اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ فرض کیجئے شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے تو شاعر اسے آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو الفاظ سے ایک مؤثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

سائنس اس معاملے میں استدلال سے کام لے گی۔جب کہ شاعر کے تخاطب جذبات ہوں گے۔شاعری محرکات کا استعمال کرتی ہے۔سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتی ہے۔جب کہ شاعری احساسات کو دلکش منظر دکھاتی ہے اور قوت تخیل سے رنگ آمیزی کرتی ہے۔شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کے نتیجے میں وجود پاتی ہے۔اسی طرح جب ہم شاعر کو شاعری کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہم یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ آیا یہ شاعر ان تمام باتوں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔امکانات کی راہیں طے کر پایا یا پھر ابھی تجرباتی مرحلے پر ہے۔شاعری احساس ذات اور عظمت کائنات کی تشریح اپنے

حساس اور موثر ترین انداز میں کرتی ہے۔ جس کا دائرہ جمالیات کی راہوں سے ہوتا ہوا واردات قلبی تک پہنچ جاتا ہے پھر الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر شعر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہر حساس دل کی پکار بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعر کا پورا نظام لفظ کی بنیاد پر مرتب ہوتا ہے۔ شاعر کوشش کرتا ہے کہ لفظ اس کے تجربہ کا حصار نہ بن سکیں اور وہ ان کے حدود و قیود سے آگے جا کر الفاظ کو وسیع اور بسیط جمالیاتی وحدت کا ترجمان بنا دے۔ اور پھر ہر خاص و عام کے دل کی آواز بن جائیں۔ بقول میر

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

جذبات کی یہی مخصوص صورتیں کسی نہ کسی حالت یا کیفیت سے تیار ہوتی ہیں جن پر زمانی و مکانی تغیرات و تبدل کا برائے راست اثر پڑتا ہے۔ شاعر ان تمام تبدیلوں کو محسوس کرتا ہے اور انہیں پھر تجربے میں بدل دیتا ہے یہی تجربہ جمالیاتی وحدت میں ڈھل کر شعر بن جاتا ہے۔ زمانے کے تیز رفتار ترقی نے جذبات کی کیفیات کو بہت حد تک متاثر کیا۔ تصور عشق بدل گیا۔ محبت کا شیوہ بدل گیا محبوب کی چاہت بدل گئی۔ تبدیل شدہ فکری و جمالیاتی قدریں گھٹ کر ذاتی تجربے تک سمٹ گئی۔ مجموعی وحدت کئی نظریات کی نظر ہوگئی۔ اب ظاہر سی بات ہے اس کا اثر ہمارے شعر و ادب پر بھی پڑا۔ ان تمام تبدیلوں کو شعر و ادب میں محسوس کیا گیا۔ ان سب نے ہمارے اذہان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور سوالات کے گھیرے میں لا کھڑا کیا اور ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ عالمی سطح پر انسانی جہد مسلسل سے پیدا ہونے والے عہد بہ عہد تجربے، تفکرات، نظریات اور مختلف رویوں نے ہماری شاعری پر کیا اثرات مرتب کیے اور ہماری شاعری نے ان تمام نظریات، تفکرات، تجربات اور مختلف رویوں سے کیا حاصل کیا۔ اور مزاج شاعری پر کیا اثر پڑا۔ اس کی ایک طویل تاریخ ہے جس کا ذکر تھوڑا مشکل بھی ہے اور ناممکن بھی۔ اس لیے ہم گزشتہ ڈیڑھ صدی میں رونما ہونے والی تبدیلوں اور تغیرات کا ہی ذکر کریں گے جن سے ہمارے شعرا کا کلاسیکی مزاج بدلا اور انہوں نے نئے عہد کے نئے تقاضوں کے مطابق پر شعر کہے۔ پہلی بات یہ کہ ہمیں یہ حقیقت قبول کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہر زمانے کا ادب کسی نہ کسی طرح سے گزشتہ سے پیوستہ

ومربوط ہوتا ہے حالانکہ پورے طور پر تو نہیں کہہ سکتے لیکن بہت حد تک روایت سے مربوط ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان تمام تبدیلوں کو قبول نہیں کرتا جن سے انفرادیت کا پہلو غائب ہو جائے۔ روایت کی اس کڑی سے منسلک ضرور رہتا ہے جس نے ایک ہیئت اور الفاظ کی ترتیب و تنظیم کا نظام فراہم کیا ہو۔ یہی معاملہ بیسویں اور اکیسویں میں تخلیق ہونے والے ادب کا ہے اسے بھی انیسویں صدی کے کلاسیکی اور انیسویں صدی کے وسط سے ہونے والے ادبی و تجرباتی تسلسل کا نام دیا جاتا ہے۔ جو اپنی سرشت میں مکمل طور پر الگ نہیں اور نہ ہی اپنی کوئی ٹھوس شکل متعین کر سکا۔ ہاں عالمی سطح پر ہونے والی نظریاتی تبدیلوں سے اثر انداز ضرور ہوا۔ اسی لئے نظریہ کی بنیاد پر اپنا نام بھی رکھ لیا جیسے جو ادب اشتراکی یا مارکسی نظریہ کا ترجمان ہوا وہ اردو میں ترقی پسند ادب کہلایا اور جس نے وجودیت کا سہارا لیا وہ جدید کہلایا وغیرہ۔ ادب میں یہ سب تبدیلیاں اور تجربے انیسویں اور بیسویں صدی میں عالمی سطح پر ہونے والے بڑے تغیرات اور انقلابات کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ تاریخ نے کسی زمانے میں اتنے تغیرات نہیں دیکھے جتنے ان دو صدیوں میں۔ صنعتی انقلاب آیا، عظیم سائنسی دریافتیں ہوئیں، یورپی سامراج کا عروج و زوال ہوا، دو عالمی جنگیں ہوئیں، کمیونزم، کیپٹلزم اور جمہوریت جیسے نئے تصورات عملی زندگی کا حصہ بنے، بڑی بڑی تحریکیں چلی، کچھ نئے ممالک وجود میں آئے، بڑے بڑے رہنماؤں کے نام سامنے آئے، بڑے بڑے سائنس دان پیدا ہوئے، مایہ ناز ادیب، مفکر، نظریہ ساز، فن کار، فلمساز، شاعر و نغمہ نگار وغیرہ سب ان دو صدیوں میں ہی دیکھے گئے۔ گویا انسان نے غیر معمولی ترقی کی۔ ان سب تبدیلوں نے انسانی زندگی کی رفتار بہت تیز کر دی۔ اس سے ہمارا وقت تو بچا لیکن ہمارا قیمتی اثاثہ ہمارے جذبات و احساسات کی دنیا ویران ہو گئی۔ مشینی دور میں ماضی معدوم ہوا اور حافظہ محدود ہو گیا۔ عالمی معاشرہ کئی طرح کے سیاسی و سماجی بحران سے دوچار ہوا۔ اجتمائی مفادات ذاتی تعصّبات میں بدل گئے۔ انسان اجتماعی شعور سے نکل کر ذات کے محدود دائرہ تک سمٹ کر رہ گیا۔ جو ممالک رواداری اور بھائی چارے کی تہذیب پر نازاں تھے وہ عجیب طرح کے نسلی و قومی و مذہبی امتیازات کا شکار ہو گئے۔ اقلیت و اکثریت کا تصور ابھر کر سامنے آیا جس سے انسانوں عجیب طرح کا فکری اور حسیاتی بحران پیدا

ہوا۔ان تمام تبدیلوں کے بعد ایک نئی صورت نظر آنا شروع ہوگئی۔ایک نیا معاشرتی نظام زندگی ترتیب پانا شروع ہوگیا۔ جو قومیں پہلے کئی امتیازات کی بنا پر برسر پیکار تھیں اب ان سے باہر آنے کی جدوجہد میں لگ گئیں۔ یورپی اقوام دو دھڑوں میں بٹ گئی۔یعنی دائیں اور بائیں بازو تنظیم سازی کا عمل شروع ہوا جس کے مثبت اور منفی دونوں اثرات دیکھے گئے اور انسان وانسانیت کی بقاء کی نئی نئی توضیحات پیش کی گئی جس کے نتیجے میں ایک نیا معاشرہ ترتیب پانا شروع ہوگیا۔انسان صدیوں کے تحفظات تعصّبات سے باہر نکل شروع ہوگیا اور ہمہ گیریت کی راہیں ہموار ہونا شروع ہوگئی۔اب سورج کے طلوع ہونے کا اثر آدھی دنیا سے نکل کر باقی دنیا پر بھی ہونے لگا۔ ہر چیز کو تاریخ کی تحویل میں سونپنے کا رجحان کم ہوا اور انسان کے ان مسائل کو اجاگر کرنے میں بڑا سنجیدہ نظر آیا۔ان سب تبدیلیوں کو ہماری شاعری نے بھی قبول کیا اور اپنے موضوعات کا دائرہ وسیع کرنا شروع کیا۔اسی زمانے میں جس نظریاتی تبدیلی کو زیادہ محسوس کیا گیا وہ تھا مارکس کا نظریہ اشتراکیت تھا۔ جسے ہماری شاعری نے بہت حد تک قبول کیا اور کامیابی کے ساتھ برتا بھی۔ جہاں تک اس نظریے کے پھیلاؤ اور ردوقبول کا معاملہ ہے تو بیسویں صدی میں مارکس کا اشتراکی نظریہ یورپ سے نکل کر باقی ممالک میں بھی اپنا اثر دکھانے لگا۔کمزور اور سامراجی طاقتوں کے زیر اثر اقوام نے اسے اپنی عافیت ونجات کا ذریعہ سمجھا۔جس سے جمہوریت کی راہیں ہموار ہونا شروع ہوئی اور استعماری قوتیں کا اثر کم ہونے لگا۔ یہ نظریہ آہستہ آہستہ ایک مضبوط سیاسی وسماجی تحریک وجدوجہد کی صورت اختیار کر گیا جس نے ہمارے شعبہ ہائے زندگی کے ہر پہلو کو بے حد متاثر کیا۔ادب چونکہ سماجی بدلاؤ کے نتیجے میں پیدا ہوا تو بھلا یہ کیسے ممکن ہوتا کہ ادب اور ہمارے شاعر و ادیب اس سے متاثر نہ ہوتے۔ اردو میں تو اسی نظریہ کی اثاث پر ایک باقاعدہ تحریک بھی چلی جو ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور جس نے نہ صرف ہمارے ذخیرہ ادب میں اضافہ کیا بلکہ اردو زبان کو کئی تبدیلیوں اور موضوعاتی جہات سے بھی ہم کنار کیا۔ادب میں موضوعاتی تبدیلیوں کا یہ رجحان ترقی پسند تحریک تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس کے بعد اشتراکی نظریہ کے تحت شاعری کی گئی اور عام آدمی، مزدور، بے گھر، استحصال زدہ طبقہ کو کامیابی کے ساتھ شعری پیرائے میں بیان کیا گیا۔مظلوم کی آواز میں

شاعری کی گئی۔ اس کے حقوق کی آواز اٹھائی گئی۔ اس کے اندر اس شعور کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی جس کی بنیاد پر وہ اپنے حق کی دہائی دینے کا اہل بنتا۔ اردو شاعری کو نئی سماجی اور ذہنی تبدیلیوں کے مطابق افکار و اظہار کی سطح پر عوام پرور بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی اور اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اور اس عہد کے تمام مسائل اور ان سے دوچار عوام کو محسوس کیا گیا اور پھر یہ سب شاعری میں احتجاجی صورت میں ظاہر ہوئے۔ سرمایہ دار طبقہ کی سیاست اور جمہور دشمن رویوں کو موضوع سخن بنایا گیا۔ بقول اقبال

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

اشتراکیت پسند شعراء کی شاعری میں سرمایہ دار طبقہ کے خلاف بغاوت کھلا اظہار کیا گیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں سرمایہ داری نظام کی استحصالی پالیسیوں کا پردہ چاک کر کے غریب عوام کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کس طرح سرمایہ دار آپ کی خواہشوں اور تمناؤں کا خون کرتے ہیں، کیسے پوری قوم کی دولت چند خاندانوں میں جمع ہو کر رہ گئی ہے، کارخانوں میں مزدور طبقے کا کس طرح سے استحصال کیا جاتا ہے، کسانوں کو زمین کی ملکیت سے بے دخل کرنے کے لئے کیسے کیسے ہتھکنڈے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ان شعراء نے معاشی مساوت کی بات کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ کس طرح سے اس ظلم و ستم کا علاج کیا جائے گا۔ حالانکہ شعراء کو اس روش کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ جن میں علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، مجاز، کیفی اعظمی، وغیرہ کچھ شعراء نے تو خالص مزدور طبقے کی بات کی جن میں احسان دانش پیش پیش رہے۔ ان کا شعر ہے:

شہر میں مزدور جیسا در بدر کوئی نہیں
جس نے سب کے گھر بنایا اس کا گھر کوئی نہیں

اسی طرح جب ہم فیض احمد فیض کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو ان کی شاعری کا بیشتر حصہ مظلوم و مقہور کی زندگی کا نوحہ ہے۔ جیسے وہ اپنی نظم ''رقیب سے'' کے آخر میں مزدور سے اپنی ہمدردی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت

شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

فیض کے بعد اسرار الحق مجاز نے تو ''مزدوروں کا گیت'' کے عنوان سے باقاعدہ ایک نظم کہہ ڈالی جس میں انہوں نے پوری طاقت و معیشت کا پروردہ مزدور کو بتایا اور مزدوروں کے جذبات کو کچھ اس طرح ابھارا ہے کہ وہ نظام کہن کو اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کی جرائت و ہمت جٹانے کا دعویٰ تک کر بیٹھتے ہیں۔ مزدوروں کے جسم کی طاقت، سینے میں جذبات کی حرارت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی بے پناہ صلاحیت کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم کیا ہیں کبھی دکھلا دیں گے
ہم نظم کہن کو ڈھا دیں گے
ہم ارض و سما کو ہلا دیں گے
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم
ہم جسم میں طاقت رکھتے ہیں
سینوں میں حرارت رکھتے ہیں
ہم عزم بغاوت رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

اسی طرح جمیل مظہری نے مزدور کی بے بسی اور افلاس زدہ حالت کو ایک انوکھی ترکیب میں اپنی نظم ''مزدور کی بانسری'' کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ جہاں مزدور کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اسے انسانیت کے سینے پر رستا ہوا ناسور سمجھا جاتا ہے جہاں اس کی ہڈیوں کا سرمہ دولت کی آنکھوں میں لگتا ہے۔ جس کے لیے موسم کی کوئی تفریق نہیں چاہے گرمی ہو یا سردی، بہار ہو یا خزاں اس کے لیے کوئی بھی موسم راحت جاں نہیں۔ وہ ضروریات زندگی کی سہولیات سے محروم اس طرح کی زندگی جینے پر مجبور ہے جہاں اس میں اور حیوانوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم، مجبور تھے ہم، مجبور ہیں ہم
انسانیت کے سینے میں رستا ہوا اک ناسور ہیں ہم
دولت کی آنکھوں کا سرمہ بنتا ہے ہماری ہڈی سے
مندر کے دیئے بھی جلتے ہیں مزدور کی پگھلی چربی سے
بیساکھ کے تپتے موسم میں، ساون کی بھری برساتوں میں
کپڑے کی ضرورت ہی کیا ہے مزدوروں کو، حیوانوں کو

ان کے علاوہ باقی شعراء میں سرور بارہ بنکوی کی نظم ''یوم مئی''، سید محمد جعفری کی نظم ''یکم مئی''، حبیب جالب کی ''یوم مئی''، شہناز پروین کی نظم ''مزدور''، سیماں اکبرآبادی کی نظم ''مزدور''، شاطر حکیمی کی دو نظمیں ''مزدور کی زندگی'' اور مزدور کی موت'' اور انور عباس کی نظم ''ترانہ یوم مزدور'' وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں مزدور کی زندگی کے تلخ ایام اور اس کی حالت زار کو پیش کیا گیا ہے۔

دیکھ اے قارون اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نا مرادی کا مرقع بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیری ہی طرح انساں مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

(سیماب اکبرآبادی)

آج مئی کا پہلا دن ہے آج کا دن مزدور کا دن ہے
ظلم و ستم کے مد مقابل حوصلہ؟ جمہور کا دن ہے

(بارہ بنکوی)

نہ ذلت کے سائے میں بچے پلیں گے
نہ ہاتھ اپنے قسمت کے ہاتھوں ملیں گے
مساوات کے دیپ گھر گھر جلیں گے
سب اہل وطن سر اٹھا کے چلیں گے

(حبیب جالب)

ہائے وہ مزدور جس کے پائے ہمت پر نثار
سنگ دل سرمایہ داری کا سر نا پائیدار

اس سے یہ افلاس کا منظر نہ دیکھا جا سکا
بے تحاشا چیخ ماری سر پٹک کر مر گیا
ایک سناٹا زمیں سے آسماں تک چھا گیا
وقت کے ماتھے پہ ہلکا سا پسینہ آ گیا

(شاطر حکیمی)

جلا ڈالو وعدوں کی جھوٹی کتابیں
غلط لکھنے والا قلم توڑ ڈالو
بجا دو تکبر کی اینٹوں سے اینٹیں
در و بام جاہ و حشم توڑ ڈالو
پہاڑوں میں رستہ بنانے کا دن ہے
یہ دن بھوک کے طیش کھانے کا دن ہے

(انور عباس)

مزدور کے بعد اشتراکیت پسند شعراء کا موضوع کسان اور اس کی زندگی بنتے ہیں۔ جس کی حالت مزدور سے زیادہ خراب وابتر بتائی جاتی ہے اور وہ انتہا درجے کا معتوب ہے۔ کسان جو محنت کرتا ہے اور اپنی محنت سے خشک زمینوں کو لالہ زاروں میں بدل دیتا ہے۔ جس کی بدولت فطرت کے رنگ حسین اور پر کشش نظر آتے ہیں اور جس نے زمین کو سرسبز و شاداب کیا۔ جس کی محنت سے کھیتوں میں ہریالی ہوتی ہے اور لہلاتے ہیں۔ لیکن اس کی اپنی زندگی بے بسی ولاچارگی کی علامت بن جاتی ہے اور اس کے لیے بھی وہی مسلہء درپیش ہے جو مزدور کے ساتھ ہے۔ کسان کے حوالے سے جوش کی نظم ''کسان'' ایک بہترین نظم کہی جاسکتی جس میں انہوں نے کسان کو صبح کا فرزند، ایک قوی انسان یعنی کاشت کار کہہ کر اسے ارتقاء کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار بنا دیا ہے۔ جس کا معمول زندگی یہ ہے

کہ جھٹپٹے کے وقت جاگتا ہے سر پر ٹوکرا، بغل میں پھاوڑا، دوش پہ ہل اور سامنے بیلوں کی جوڑی لیے روانہ ہو جاتا ہے اور زمین کے سخت سینے کو چیر کر زندگی کی حرارت بھرتا ہے۔ اس کے علاوہ جوش نے اس نظم میں کسان کے مقام و مرتبہ کو واضح کرنے کے لئے اسے وارث اسرار فطرت، فاتح امید و بیم، جلوۂ قدرت کا شاہد اور حسن فطرت کا گواہ بتایا ہے۔ ان سب کے باوجود اس کی ذاتی زندگی میں فاقہ کشی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی بیوی بے ردا، بھوک سے بچوں کے منہ اترے ہوئے اور گھر میں خاموشی کے ماتم کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشت کار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل
وارث اسرار فطرت فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقف طبع نسیم
قطع ہوتی ہی نہیں تاریک حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا (کسان)

جوش کے علاوہ باقی شعراء جن میں علی سردار جعفری، ن م راشد، کیفی اعظمی، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، احسان دانش، حبیب جالب، ساقب کانپوری وغیرہ نے بھی کسان اور مظلوم کو اپنی شاعری کا استعارہ بنایا۔ جیسے ثاقب کانپوری اپنی نظم ''غریب کسان'' میں کسان کو نیچر کا راج دلارا اور فطرت کی آنکھ کا تارا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور ہر حال میں کسان کی ہمت کا سب پر حاوی ہونا اور اس کی شوکت کا سبب بننا وغیرہ جیسی بے پناہ خوبیوں کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

اے نیچر کے راج دلارے
اے فطرت کی آنکھ کے تارے

سب پر حاوی ہمت تیری
سچی ہے یہ شوکت تیری

ساحرلدھیانوی جنہوں نے نظم ''طلوع اشتراکیت'' کہہ کر انقلاب کی آمد کی نوید سنائی۔ وہ کہتے ہیں:

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
کاندھوں پر سنگین کدالیں ہونٹوں پر بے باک ترانے
دہقانوں کے دل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے
ایک نیا سورج چمکا ہے ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

لیکن اشتراکی انقلاب کی یہ لے آگے چل کر دھیمی پڑ جاتی ہے تو جدوجہد کی منزلیں بڑھنے لگتی ہیں تو ساحر کہتے ہیں:

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دل گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

(شعاع فردا)

اس میں شک نہیں ساحرؔ، علی سردار جعفریؔ کی طرح کٹر اور بے باک قسم کے اشتراکیت پسند شاعر تھے۔ مظلوم ہو یا پھر کوئی معصوم اس کی آواز کو جس بے باکی کے ساتھ اپنی شاعری کے ذریعے اٹھایا ہے اس میں ان کے مدمقابل کوئی دوسرا شاعر نہیں ٹھہرتا۔ نظم ''بنگال'' میں ان کا لہجہ زیادہ تلخ ہو جاتا ہے تو وہ مقتضائے حال پر فلسفہ دانوں کو جہان کہنہ کے وطن اور وطن پرست مفلوج کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں پوچھتے ہیں کہ کیا اسی لئے ہم نے شاہراہیں بنائی

تھی کہ ان پر دیس کی جنتا سسک سسک کر مرے، کیا زمینیں اسی کارن اناج اگلتی ہیں کہ وطن کی عوام بھوکی مرے، ملیں اسی واسطے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں۔

جہان کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں (بنگال)

اس کے بعد ایک مرحلہ ساحر کی زندگی میں وہ بھی آتا ہے جہاں وہ لینن کی آمد کا جشن کچھ اس طرح مناتے ہیں:

طبقوں میں بٹی دنیا صدیوں سے پریشاں تھی
غمناکیاں رستی تھیں آباد خرابوں سے
عیش ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت، قدرت کے حسابوں سے
اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
بدکار "حضوروں" سے، بدنسل "جنابوں" سے
عیار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
ارباب کلیس کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدر کو آزاد کیا تو نے

مذہب کے فریبوں سے، شاہی کے عذابوں سے
(لینن)

اشتراک فلسفہ سے متاثر تمام شعراء نے اپنے اپنے طور پر زور کوشش کی کہ وہ مظلوم عوام کی آواز بنیں اور ان کے جائز مطالبات کو حکومت وقت کے سامنے رکھیں۔لیکن ایسا ممکن نہیں ہو پایا یہاں تک کہ ایک جمہوری نظام میں بھی اس مسلہ ء پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا گیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت میں بھی جمہور کسم پرسی کی زندگی جینے پر مجبور ہیں۔عہد حاضر میں حکومت کے ضدی رویوں اور نئے زرعی قوانین نے اس مسلہ ء کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے اور اب عوام کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے جس پر چل کر کوئی سبیل تلاش کی جا سکے۔اس صورتحال پر گوہر رضا کی نظم ''کسان'' نے ادبی اور سیاسی حلقوں میں کافی پزیرائی حاصل کی ہے۔اس نظم میں وہ کہتے ہیں:

تم کسانوں کو سڑکوں پہ لے آئے ہو
اب یہ سیلاب ہیں
اور یہ سیلاب تنکوں سے رکتے نہیں
یہ جو سڑکوں پہ ہیں
خودکشی کا چلن چھوڑ کر آئے ہیں
بیڑیاں پاؤں کی توڑ کر آئے ہیں
سوندھی خوشبو کی سب نے قسم کھائی ہے
اور کھیتی سے وعدہ کیا ہے کہ اب
جیت ہوگی تبھی لوٹ کر آئیں گے
اب جو آ ہی گئے ہیں تو یہ بھی سنو
جھوٹے وعدوں سے یہ ٹلنے والے نہیں
تم سے پہلے بھی جابر کئی آئے تھے

تم سے پہلے بھی شاطر کئی آئے تھے

تم سے پہلے بھی تاجر کئی آئے تھے
تم سے پہلے بھی رہزن کئی آئے تھے

اشتراکیت کی عوام پروری اور ہمارے شعراء کی شعری کاوشیں کم نہیں ہونگی۔ جب تک مظلوم عوام کی آواز اونچے ایوانوں تک نہ پہنچے گی تب تک احتجاج و مزاحمت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہمارے شاعر اس تحریک میں پیش پیش رہیں گے۔

○○○